فکری و نظریاتی اعتبار سے شکست خوردہ، ذہنی انتشار کے شکار یہ لوگ "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کے مترادف یہ دلیل پیش کرتے ہوئے دیکھے گئے کہ "سچائی سب سے بڑی قوت ہے اور عوام اس کا سرچشمہ ہیں" نہ جانے یہ لوگ مشاہدہ کے بعد بھی اظہارِ حقیقت سے کیوں عاری ہیں۔ قرآن کی زبان میں یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں، سماعتوں اور بصارتوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ چوپایوں سے بھی بدتر ہیں۔ بگوش ہوش سنو! بیشک سچائی سب سے بڑی قوت ہے لیکن خدا کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے اور وہی قوت کا سرچشمہ ہے۔ انہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کمیونزم کا بھیانک انجام جمہوریت کے عبرت ناک زوال کی نوید ہے۔ دنیا میں تغیر و تبدل کے اسباب میں سب سے بڑا سبب خالق کے فطری نظام سے بغاوت اور مخلوق کے غیر فطری نظام کی اطاعت ہے۔

<u>جہادِ افغانستان کے دس سال</u>: جہادِ افغان کو دس سال مکمل ہوئے۔ اس جہاد نے نہ صرف افغان عوام کو حوصلہ ہمت، عزم اور جینے کا شعور دیا۔ بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں میں زندگی کی ایک لہر پیدا کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی اور مشرقی دنیا کو بھی زبردست متاثر کیا۔ آج جہادِ افغانستان کے نتیجہ میں کمیونزم پوری دنیا میں ذلیل و رسوا ہو رہا ہے اور اشتراکی کوچہ گرد تیزی کے ساتھ اپنی بساط لپیٹ رہے ہیں۔ مجاہدین نے روس کو تاریخ کی ذلت آمیز شکست سے دوچار کر کے افغانستان سے اپنی فوجیں واپس بلانے پر مجبور کر دیا۔ گوربا چوف بظاہر یہی کہہ رہے ہیں کہ اب افغانستان میں میری فوج نہیں لیکن مجاہد کی عقابی نظر دشمن پر ہے۔ اُن کے بقول "بیس ہزار روسی فوجی" جو زبانی ملیشیا کی صورت میں ابھی موجود ہیں اور ہم روسیوں کے مکمل انخلاء تک اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔

افغانستان میں روسی جارحیت ہو یا پانامہ میں امریکی بربریت ہم دونوں کی مذمت کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک دونوں اسلام کے بھی دشمن ہیں اور انسانوں کے بھی۔

جہادِ افغانستان میں لاکھوں شہیدوں کا خون دوڑ رہا ہے زیر دستوں کی بالادستی اور مظلوموں کی آہِ نیم شبی کی قبولیت کا ظہور ہو چکا ہے۔

اسلام ہو پھر غلغلہ اندازِ جہاں میں
افغان کی یلغار پہاڑوں کو ہلا دے

پاکستان کے حکمران اور سیاست دان اِن حالات سے سبق سیکھیں اور اللہ کی دی ہوئی مہلت کو غنیمت سمجھیں ورنہ ع تمہاری داستاں تک نہ ہوگی داستانوں میں

اچھی یادیں

آغا شورش کاشمیریؒ

مفکرِ احرار چودھری افضل حق رحمۃ اللہ علیہ

ادیب ، مفکر ، سیاستدان

یہ مضمون آغا شورش کاشمیریؒ نے آج سے چالیس برس قبل چودھری افضل حق رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "میرا افسانہ" کے دیباچے کے طور پر تحریر کیا تھا۔
۸ جنوری ۱۹۴۲ء چودھری صاحب کا یومِ وصال ہے۔ اسی حوالہ سے ہم جنوری کے شمارہ میں یہ مضمون ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں ——— (ادارہ) ———

دسمبر ۱۹۲۲ء کی ایک صبح کا ذکر ہے دفترِ احرار میں حضرت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری۔ مولانا مظہر علی صاحب اظہرؔ۔ مولانا محمد گلشیر علیہ الرحمۃ شیخ حسام الدین صاحب۔ حضرت صومعی کاشمیری۔ خواجہ عبدالرحیم صاحب عاجزؔ ——— اور چند دوسرے دوست جمع تھے۔

بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی نے فضا کو قہقستان بنا رکھا تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری پھبتیوں کی بھاڑ باندھنے میں کچھ ایسے مشاق ہیں کہ بڑے بڑوں کی زبانوں میں لونی لگ جاتی ہے اور اچھے اچھوں کا شعلۂ گفتار کجلائی ہوئی آگ کی طرح ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ مولانا مظہر علی صاحب اظہرؔ کی گفتگو کے تیور ہی انوکھے ہیں، اور عموماً واقعات و شخصیات سے مزاح پیدا کرتے ہیں مولانا محمد گلشیر مرحوم (اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نورانی کرے) کی ثقہ باتوں میں بھی کبھی کبھی آ ہوانِ شہرؔ کی شوخی جھلکتی تھی۔ شیخ حسام الدین کے فقرے اور خواجہ عبدالرحیم عاجزؔ کے میٹھے پنجابی گیت دیہات پنجاب کی طرار دوشیزاؤں کے قہقہوں کی مانند کانوں کی راہ سے دل میں اُتر جاتے ہیں ——— اور صومعی کاشمیری کا تو رنگ ہی اور ہے، اساتذۂ ادب کے نشتروں کی چلتی پھرتی بیاض۔

شاہ جی طنزیات و مضحکات کے جدید و قدیم نکات پر حاشیہ آرائی فرما رہے تھے کہ میاں قمرالدین صاحب آ گئے۔ شاہ صاحب مسکرائے اور کہا "لیجئے میرا چلتا پھرتا بنک آ گیا ہے۔" میاں صاحب نے متبسم نگاہوں سے جائزہ لیا۔ اور پوچھا "یہ کیا گلشپ ہو رہی ہے؟"

"محض وقت کٹی" صومعی بولا

"نہیں خوش وقتی" ہم میں سے کسی ایک نے کہا۔

اور لطائف کی بازی بدنے لگی۔ باتوں باتوں میں اُردو کے اسالیب نثر کا ذکر آ گیا میں نے عرض کی یہ سچ ہے کہ اُردو نثر کا پہلا سلجھا ہوا اسلوب غالب کے خطوط ہیں، لیکن زبان کی سادگی کا سہرا سرسید مرحوم کے سر ہے اُنہوں نے نہ صرف انشا پردازی کے پارینہ سومنات پر ضرب لگائی بلکہ مطالب و اسالیب کی نشاۃ ثانیہ کے محرک بنے اور نثر اُردو میں نکھری ہوئی چاندنی کا سا جوبن آ گیا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے ہاں تکلفات کا خزانہ بدستور رہا۔ لیکن مولانا الطاف حسین حالیؔ نے سادہ اسلوبِ نگارش ہی اختیار کیا۔ علامہ شبلی نور اللہ مرقدہٗ چونکہ ایک علمی محقق تھے اور علمیات کی زبان بہر حال عوام کی سطح سے کہیں بلند ہوتی ہے اس لئے اُنہوں نے بین بین ایک متین رنگِ تحریر پیدا کیا۔ شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم دہلی کی ٹکسال پر لٹو تھے جسے ایک مقامی رنگ کی جھلکیاں کہا جا سکتا ہے۔ شررؔ مرحوم کی نثر کا رنگ منفرد نہ تھا۔ لیکن شرر پر منفرد تھا جس سے ایک صاحبِ طرز پہچانا جاتا ہے رتن ناتھ سرشار الفاظ کے شاہ خرچ تھے اور لکھنؤ کی ٹوٹتی ثقافت کے نقاش اس دور کے نثری ارتقا میں مولانا ابوالکلام آزاد کی انشا پردازی عرب کے شہسواروں کی صدائے رجز ہے اور ان کے مرصع فقرے غالب مرحوم کے خامہ نوائے سروش ہے کی شرحِ جمیل۔ مولانا ظفر علی خان صاحب طرز ادیب ہیں لیکن ان کے ہاں الفاظ ہواؤں کی طرح پُر سکون نہیں بلکہ سمندری موجوں کی مانند سرکش اور بے باک ہوتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے قلم کی چتون نہایت تیکھی ہے اور اس کی وجہ دہلی کا اچھوتا بانکپن ہے ——— ع

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

نثر کے جدید اسالیب کچھ ایسے ہیں کہ اب "قلمکاروں" کی جگہ

فنکاروں کی کھیپ آ رہی ہے یعنی صنعت انشاء کی جگہ نفسِ مضمون میں ندرت پیدا کی جاتی ہے اور زندگی کی ہمہ گیری کے باعث الفاظ کی بِنا کاری کو ثانوی جگہ دے دی گئی ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں لیکن بڑی وجہ بین الاقوامی پیداواری تعلقات ہیں جو سائنس کی عظیم الشان ترقیات کے باعث کرۂ ارض کی مختلف آبادیوں کو ایک مسلسل آبادی کی صورت میں مربوط کئے ہوئے ہیں اور طبائع انسانی ہر شعبۂ حیات میں اختصار پسند ہو گئی ہیں۔

چونکہ دائرۂ زندگی وسیع ہو گیا ہے اس لئے ادب بھی کئی اصناف میں منتشر ہے اور ہر صنف بجائے خود ایک مکمل باب ہے۔

تنقیدی ادب کے مختلف زاویے ہیں۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ اسلامیات کا مرکز ہے۔ جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے یورپی ادب کی ٹھوس معیاری کتابیں ترجمہ کی ہیں جو تاریخ، ریاضی، تمدن، معاشرت، علم نفس اور سائنس کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ ہے۔ انجمن ترقی اردو دہلی اردو کی جامعیت کو بلحاظ فن پورا کر رہی ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد اسی شاہراہ پر گامزن ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی "سیاسیات" کی تشنگی بجھا رہا ہے۔ پنجاب میں ادب و شعر کے نئے نئے تجربے کئے جا رہے ہیں بالخصوص اردو صحافت میں اولیت کا سہرا پنجاب ہی کو حاصل ہے۔

جہاں تک افراد اور نثر کے مختلف دائروں کا تعلق ہے علمیات، ادبیات اور درسیات میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالحق، پنڈت برجموہن دتاتریہ، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب حسن، ڈاکٹر رضی الدین، ڈاکٹر یوسف حسن، پروفیسر محمود شیرانی، علامہ تاجور نجیب آبادی، علامہ عبداللہ العمادی اور ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی مساعی ناقابلِ فراموش ہیں۔

نئے ادبی نقادوں میں ڈاکٹر محی الدین زور، سید احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، کلیم الدین ایم۔ اے، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، آغا بیدار بخت خاں ایم۔ اے، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، سید آل احمد سرور، پروفیسر رشید احمد صدیقی کا زاویۂ نگاہ قدیم اندازِ تنقید سے قطعی مختلف ہے۔ مزاح میں فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی اور جناب پطرس مخصوص انفرادیت کے مالک ہیں۔ منشی سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ کا طنز جراح کے نشتر کی طرح تیز تھا لیکن قاضی عبدالغفار ایڈیٹر پیام حیدر آباد دکن کا طنز تیکھا اور ہلکا ہوتا ہے یعنی قہقہہ اور تبسم کے بین بین۔ عبدالمجید سالک قومی معاملات میں شخصیات اور واقعات سے تضحیک کا ادبی پہلو نکالنے میں لاثانی ہیں۔ ظفر علی خاں، محمد رفیع سودا اور انشاء اللہ خاں انشا کی طرح منتقم زیادہ ہیں اور حریفِ سخن کم، اور بقول غالب ؏ کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی۔ "سندباد جہازی" کے اسلوبِ نگارش پر فسانہ آزاد کا پرتو ہے اور ہمیشہ "مطائبات" میں متاعِ غیر سے دکان سجاتے ہیں لیکن ان کے پیمانوں کا بادہ کبھی کبھی خود کشیدہ بھی ہوتا ہے۔

افسانہ نگاری میں منشی پریم چند کی سی خوبی اس کے ہمعصروں اور پیروں میں نہیں اگرچہ افسانہ اور ناول کا ذوق روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور ہمارے شگفتہ قلم نوجوان اس میدان میں خوب خوب تجربے کر رہے ہیں۔ کرشن چندر تو جلد جلد شہرت کے زینہ پر پہنچ گیا ہے لیکن دیویندر ستیارتھی کے مشاہدہ میں عمق زیادہ ہے اور احمد ندیم قاسمی کے دیہاتی افسانوں کا گھاؤ گہرا ہے۔ میرزا ادیب نے صحرانورد کے خطوط میں اپنے فن کی معراج کا پتہ دیا تھا۔ لیکن صحرانورد کے رومان، غلاموں کی بغاوت اور موت کا راگ میرزا ادیب کی وجہ سے مشہور ہیں جیسے فسانہ آزاد کی وجہ سے رتن ناتھ سرشار مشہور ہوئے! اور ان کی دوسری تصانیف خود انکی وجہ سے مشہور ہیں۔ میں ابھی کہہ ہی رہا تھا کہ خواجہ عبدالرحیم عاجز نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا چودھری صاحب مرحوم کا ادبی رتبہ کیا ہے؟

میں نے عرض کی کہ ان کی سیاسی عمر ادبی عمر سے کہیں زیادہ ہے۔

عاجز۔ اس کا مطلب؟

میں۔ مطلب تو واضح ہے کہ تاریخ انہیں دیر تک ادیب کی بجائے سیاسی زعیم کی حیثیت میں محفوظ رکھے گی۔

عاجز۔ تو کیا ابوالکلام اور ظفر علی خاں کی پوزیشن بھی یہی ہے۔

میں۔ ابوالکلام استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔ ظفر علی خاں ادبیات کی راہ سے سیاسیات میں داخل ہوئے ہیں اور چودھری صاحب نے سیاسیات کیلئے ادبیات میں قدم رکھا ہے۔ اس کے علاوہ چودھری صاحب ادبیات کو کسی مقصد کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انہیں ادبیات سے اس لئے لگاؤ ہے کہ وہ اپنے ماحول کے مزاج سے آشنا ہیں اور طاؤس و رباب کے شیدائیوں سے انہی کے رنگ میں اپنی سی بات کہنا چاہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ انہوں نے ادب کو ادب کی خاطر نہیں بلکہ نفسیات عمومی کے اندازہ شناس کی حیثیت میں مقصد کی خاطر اختیار کیا ہے اور ان کی جبینِ افکار پر شعر و ادب کی درخشندگی کے ساتھ ساتھ سیاسیات کی برہمی پائی جاتی ہے۔ جو انہیں مولانا محمد علی مرحوم کی طرح ایک سیاسی راہنما کے طور پر متمیز کرتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ چودھری صاحب کی "زندگی" "آزادیٔ ہند" "محبوبِ خدا" "جواہرات" "دینِ اسلام" اور "میرا افسانہ" وغیرہ تصنیفات اردو نثر میں اپنا ادبی درجہ نہیں رکھتیں۔ اور ان میں اسالیبِ بیان کی خوبصورتی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ہے اور ایک صاحبِ طرز کا سا انداز رکھتا ہے۔ لیکن علامہ اقبال کی طرح وہ ادیب و شاعر کے مقام سے آگے ہیں اور یہی ان کی بنیادی خوبی ہے۔

علامہ اقبال متاعِ دین و دانش کے لٹ جانے پر پکارتے تھے کہ یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی؟ اور پھر ہندوستانی مسلمانوں کی سرد لاش پر نوحہ کرتے ہوئے لکھا تھا ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے • مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

لیکن چودھری صاحب کے ہاں قنوطیت کا گذر تک نہیں اور نہ الم و یاس کی تلخیاں ہیں انکے نزدیک زندگی خیر الناس من ینفع الناس کا آئینہ ہے۔ جو شکست سرائی سے زنگ آلود ہوتا ہے اور ماضی کی یاد میں سینہ کوبی سے ٹوٹ جاتا ہے۔

ان اشارات سے علامہ اقبال مرحوم کی فکر کا استہزا منظور نہیں بلکہ ایک ہی منزل کے دو مختلف راہیوں اور داعیوں کی دعوتِ سفر اور اندازِ رفتار کے حدود واضح کرنا مقصود ہے ـــــ "زندگی" بقول چراغ حسن حسرت صحتِ خیال اور پاکیزگیٔ مطالب کے اعتبار سے دورِ حاضر کے اکثر معنی طراز ادیبوں کی دقیقہ سنجیوں پر فوقیت رکھتی ہے اور اس کی سطور میں جوش و سرمستی اور خلوص و صداقت کا جو پر تو نظر آتا ہے وہ ادیبوں کی الفاظ آرائیوں کو کہاں نصیب ہے ؏ یک ذرۂ دردِ دل از علمِ فلاطوں بہ

"آزادیٔ ہند" ایک طویل افسانہ ہے جو ہندو و مسلم اتحاد کے صادق جذبہ پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں چودھری صاحب کا پیرایۂ بیان اور مقصد کی افادیت صبح بہار کی طرح خنداں ہے۔ بعض ناول نگار اور افسانہ نویس اپنے افادی پہلو کو کہانی کے پس منظر میں رکھتے ہیں اور اپنے پلاٹ کا تانا بانا بُنتے ہیں۔ چودھری صاحب نے آزادیٔ ہند میں کہیں بھی اجمال اور ابہام پیدا نہیں ہونے دیا۔ بلکہ پس منظر اول، پلاٹ کو دوم اور زبان کو سوم جگہ دے کر ان تینوں کے امتزاج سے ایک ایسا خمیر تیار کیا ہے۔ جو کسی طرح ایک مؤثر سیاسی نسخے سے کم نہیں۔

سارے افسانے میں شاعر کی زبان، سیاسی راہنما کا نصب العین اور بے خوف سپاہی کی گرمجوشی پائی جاتی ہے۔

"محبوب خدا" ایک نثریہ نعت ہے شروع سے آخر تک سیرت رسول کو عقیدت و اختصاص کی زبان میں بیان کیا ہے اور اسوۂ حسنہ کے مختلف مناظر بڑی دلچسپی اور موثرات سے مسلمانوں کو اخذ خیر و برکت کی دعوت دی ہے غزوات کا تذکرہ خاص طور پر تلواروں کے صیقل کی طرح شفاف ہے۔

"جواہرات" چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔ الفاظ سے طرح طرح کے رنگ پیدا کئے گئے ہیں۔ اس میں کچھ افسانے تو مترنم الفاظ کی ساحری ہیں اور کچھ افسانے ایک حادثہ، ایک سانحہ، ایک واقعہ اور ایک معاشرتی یا سماجی روایت کا مظہر ہیں جنہیں خوش آہنگ قلم سے افسانہ بنا دیا گیا ہے۔ دیپک راگ، اور کوئٹہ پر موت کا پہرہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے علامہ راشد الخیری کی تحریر کے تتبع کا قیاس ہوتا ہے جس طرح علامہ راشد الخیری افسانوی تکنیک کی بجائے اسلوب انشاء کو مقدم رکھتے تھے اور الفاظ پر ان کی استادانہ دسترس سے مختلف قسم کی فضائیں پیدا ہوتی تھیں یہی انداز جواہرات کا ہے کہ الفاظ اپنے گرد و پیش کی خود بخود نمائندگی کرتے ہوئے قاری کی گذرگاہ خیال سے گذر جاتے ہیں اور نتیجۃً افسانہ سمٹ کر سیاہی کی چوٹ یا تمدنی نشتر بن جاتا ہے۔

"زمین اسلام" "تاریخ حجاز" اور دوسری کتابوں میں ان کی موضوعی حیثیت کے علاوہ جو چیز قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے وہ چودھری صاحب کا پُرجوش انداز بیان ہے جو کبھی شوخی بن کر جھلکتا ہے کبھی تقویٰ کی طرح خشک ہو جاتا ہے کبھی پیام شرابِ سیلاب چھلکتا ہے کہیں رعنا فقرے رنگوں کے جزیرے معلوم ہوتے ہیں اور کہیں عبارت اس قدر دلکش ہو جاتی ہے جیسے نگاہ غیر کی گستاخی سے کسی پردہ نشین کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی ہو۔ ان کے قلم کا ایک بنیادی وصف منظر نگاری بھی ہے جو بعض اوقات منظر سے زیادہ دلکش ہو جاتا ہے اور الفاظ کی تصویریں رنگوں کے نقوش سے بڑھ جاتی ہیں۔

"میرا افسانہ" حصہ اوّل و دوم، چودھری صاحب کے خود نوشتہ حالاتِ زندگی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنا اسلوب نگارش یہاں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا لیکن بعض مقامات پر رُک سے گئے ہیں یعنی ایک طرح کی افسردگی سی پائی جاتی ہے اور غالباً اسکی وجہ انکی بیماری ہے چونکہ اپنے آخری ایام زندگی میں وہ چراغ مفلس کی طرح بجھ سے گئے تھے، اور مسلمانوں کے سیاسی جمود نے ان کے احساس و تفکر و زندگی دونوں پر جو اثر ڈالا تھا اس سے ان کی تحریروں میں افسردگی زیادہ ہے ورنہ ان کی تحریروں میں نہیں بلکہ عنفوان شباب کی جھلکیاں موجود ہیں لیکن جوانی کا خمار تک نہیں۔

اپنے سوانح زندگی آپ لکھنا خود ایک عظیم سانحہ ہے کیونکہ زندگی حرفِ گفتنی ہی نہیں سخن ناگفتنی بھی ہے، دوسرے الفاظ میں زندگی صبح کی آب و تاب ہی نہیں بلکہ عمر کی سیاہ راتیں بھی آتی ہیں۔

اگرچہ شخصیات کے سوانح زندگی تاریخ کا جزو غیر منفک ہیں۔ اور اس سے ہمیں زندگی کے بننے بگڑنے کا علم ہوتا ہے۔ لیکن بہ قول سید سلیمان ندوی "سوانح نگار کا قلم اپنے ہیرو کی زندگی کا جو مرقع کھینچتا ہے وہ صرف ان کے ظاہری خط و خال کی نقاشی ہوتی ہے۔ عمق قلب کے اندر جو رموز اور اسرار ہیں اور جن سے اصل انسانیت عبارت ہے ان کی تصویر کشی کے لئے جو رنگ درکار ہے وہ دوسروں کو میسر نہیں آ سکتا۔ لوگوں کی خود نوشت سوانح عمریاں ایک حد تک اس کی تلافی کرتی ہیں لیکن چونکہ انسان یہ سمجھ کر اپنے حالات حوالہ قلم کرتا ہے کہ ایک دن یہ مجموعہ لوگوں کے ہاتھ میں جائے گا۔ اس لئے اس تصویر میں جہاں عیب ہیں وہ ان پر سیاہی پھیرتا جاتا ہے اور اس بنا پر یہ مرقع بھی اصل کی سچی شبیہ نہیں ہوتی۔"

بین الاقوامی ادب سے قطع نظر اردو میں جس قدر خود نوشت سوانح عمریاں ہیں۔ (یہاں تراجم کا ذکر نہیں بلکہ بلاواسطہ اردو میں لکھی ہوئی سوانح عمریوں کا ذکر مقصود ہے) ان میں شاعری زیادہ اور اصلیت کم ہے اور غالباً ایک نغز گو شاعر اس سے بہتر طریق پر ایک حسین مدت میں اپنی ساری زندگی کہہ جاتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ کے چند صفحوں میں اپنی زندگی کے چند مقامات کو نہایت خوبصورت لفظوں میں بیان کیا ہے لیکن حافظ کے یہ مصرعے اس سے کہیں مختصر اور جامع ہیں کہ ع

ساقیا عمر گرانمایہ من عاد جوانی است

یا ——— بہار توبہ شکن میرسد چہ چارہ کنم

تذکرے کے ان صفحوں کو پڑھتے جایئے، ایک ترنگ کا عالم ہوگا اور نتیجہ "ایک نالۂ گرم اور آہ سرد میں پوری حکایت ختم ہے"۔ یا ابو طالب کلیم کے یہ چار مصرعے جنہیں مولانا نے اپنی پوری سوانح عمری قرار دیا ہے ؎

بدنامیٔ حیات دو روزے نہ بود بیش

آنہم کلیم با تو بگویم چساں گذشت

یک روز صرف بستن دل شد بایں و آں

روز دیگر بکندن دل زیں و آں گذشت

"میرا افسانہ" میں چودھری صاحب نے نہ تو مولانا ابوالکلام کی طرح اپنی زندگی کو غم و برق کا معاملہ اور آتش و خس کا افسانہ بنا کر انشاء پردازی کا معبد بنایا ہے اور نہ خواجہ حسن نظامی کی طرح "آپ بیتی" میں زمانہ سے بیتی باتوں کی نمائش کی ہے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی ایام کا تذکرہ کرکے مدرسہ و ملازمت کی کہانی چند صفحوں میں ختم کر دی ہے اور